طاہر جیانی

توحید اور ڈیموکریسی

کسی معاشرے کے اہلِ ایمان توحید پر یقین رکھنے کے بعد، کیا وہ ڈیموکریسی جیسے سیاسی نظام کے پیروکار بن کر اپنی زندگی بسر کرسکتے ہیں؟ کیا ان کے دین و ایمان پر کوئی فرق نہیں پڑے گا؟ کیا ان دونوں نظریات پر ایک ہی وقت میں یقین رکھنے سے انسان تضاد کا شکار نہیں ہوتا؟

اللہ تعالیٰ کو ایک معبودِ برحق ماننا، تمام اختیارات ذاتِ مقدس میں مرتکز سمجھنا، قوت اور طاقت کا سرچشمہ صرف اسی کو تسلیم کرنا، زندگی کے بنیادی اصول (انفرادی اور اجتماعی) جن پر چل کر ایک انسانی معاشرہ وجود میں آتا ہے، ان امور میں صرف اللہ تعالیٰ کو حاکم اور صاحب الامر یقین کرنا، یہ ایمان باللہ اور توحید کے تقاضے ہیں۔ جبکہ اس کے مقابل ایک ایسا نظریہ ہو جس میں قوت اور طاقت کا سرچشمہ فقط عوام ہوں، معاشرے کے لئے اصول متعین کرنا اور قوانین سازی صرف ان کی رائے اور رضامندی پر منحصر ہو، ہر مسئلے اور ہر معاملے میں رائے کی آزادی اس حد تک ہو کہ ہر انسان ہر وقت اپنا مذہب بھی تبدیل کرسکتا ہے، ہر مذہبی معتقدات پر کھلے عام تنقید بھی کرسکتا ہے، ہر چیز کھانے اور پینے کی استعمال کرسکتا ہے سوائے ان چیزوں کے جو ان کی سمجھ میں آئیں کہ یہ مضر صحت ہیں، ہر معاملے میں معاشرے کے انسانوں کی رائے اور ان کا تجربہ اتھارٹی تسلیم کیا جائے، کسی ایسی دوسری قوت اور ہستی کو نہ مانا جائے جو زندگی گذارنے کے اصول متعین کرے اور پھر ان پر چلا جائے، یہ ڈیموکریسی کے تقاضے ہیں۔ اس طرح کے سیاسی نظام کو جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب بات واضح ہونی چاہیے کہ ایمان باللہ اور توحید کا فلسفہ اور اس کے تقاضے کیا ہیں اور ڈیموکریسی جیسے سیاسی نظام اور نظریہ حیات کے تقاضے اور اثرات کیا ہیں؟ کیا کوئی شخص ایک ہی وقت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر ایمان اور ڈیموکریسی پر یقین رکھ سکتا ہے؟ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یا تو وہ شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے میں مخلص نہیں یا پھر وہ ڈیموکریسی کے فلسفہ پر کامل یقین نہیں رکھتا۔ ایسے معاشرے جہاں ظاہری طور پر مسلمان موجود ہیں اور ان کا سیاسی نظام ڈیموکریسی ہے تو ان معاشروں کو منافق معاشرہ کہنا درست ہوگا۔

ڈیموکریسی کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ مذہب اور ریاست کی راہیں قطعی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ مذہب فقط چند عقیدوں اور رسومات پر مشتمل ہے جو انسان کا انفرادی معاملہ ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً تبدیلی بھی کرسکتا ہے اور کسی مذہب کا پابند نہ ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ جبکہ ریاست کے لئے اصول و قوانین وضع کرنے کا کلی اختیار انسان کے پاس ہے۔ وہ اپنے تجربے اور شعور سے جن چیزوں کو جس وقت مناسب سمجھے، اس پر عمل کرے۔ اس کی آزادی پر کوئی قدغن نہیں۔ ریاست کے امور پر مذہب کی نہ صرف بالادستی نہیں ہے، بلکہ سرے سے اس کا کوئی عمل دخل بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو سیکولر معاشرہ بھی کہتے ہیں کہ اس معاشرہ میں مذہب کا خانہ جدا ہے اور ریاست کا جدا۔

اس طرح کے سیکولر معاشروں کی مثال امریکہ اور یورپ کے ممالک ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان ممالک میں ڈیموکریسی نظامِ سیاست چل رہا ہے۔ اسلام میں شراب کا استعمال حرام قرار دیا گیا ہے۔ عیسائیت اور یہودیت میں بھی اس کا پینا مباح نہیں مگر امریکہ کی پارلیمنٹ نے ووٹوں کی اکثریت سے شراب کی حرمت ختم کردی۔ یہی کچھ یورپی ممالک نے کیا

ہے۔ اس طرح ہم جنس پرستی کسی مذہب میں جائز نہیں مگر برطانیہ کی پارلیمنٹ نے عوام کے رجحانات کو دیکھ کر اس کو جائز قرار دیا ہے۔ اب وہاں دو مرد یا دو عورتیں آپس میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوا کہ ڈیموکریسی نظامِ سیاست میں قوانین سازی عوامی تقاضوں پر ہوتی ہے۔ ان کا یہ طے شدہ اصول ہے کہ عوام کی رائے کے مطابق ریاست کو چلنا ہے۔ مگر توحید کا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی گذارنے کے جو اصول خداوندِ قدوس نے انسانوں کے لئے طے کیے ہیں، ان کو ماننا ہوگا، ان کی بالادستی ہوگی، ان کے خلاف کوئی قانون بنانا اور اس پر چلنا شرک اور کفر کے مترادف ہوگا۔ دینِ اسلام میں ریاستی سربراہ کے لئے بنیادی اوصاف علم، تقویٰ، شجاعت، صلاحیت اور خدمت خلق وغیرہ کے امور لازمًا ہونے چاہئیں اور ایسے انسان کو عوام براہ راست اپنی آزاد مرضی سے منتخب کریں اور پھر ریاستی امور کو چلانے کے لئے ایک مجلس شوریٰ کا تقرر ہو اور اس مجلس کے ممبر کے لئے بھی انہی اوصاف کا ہونا ضروری ہے جو اوصاف سربراہ کے لئے ضروری ہیں۔ یہاں سربراہ ریاست اور اراکین مجلس شوریٰ کسی مرحلہ پر بھی آمریت اور ڈکٹیٹرشپ اختیار نہیں کرسکتے۔ وہ پابند ہوں گے کہ ریاست کا نظام قرآن و سنت کے طے کردہ اصولوں کے تحت چلائیں۔ وہ یک سرمو بھی ان اصولوں سے انحراف نہیں کرسکتے۔ ان اصولوں سے انحراف، بغاوت یا عملی زندگی میں ادنیٰ درجے کی منافقت ان افراد کی نااہلیت کے لیے کافی ہوگا اور پھر ایسے افراد ایک دن بھی اسلامی ریاست کے ذمہ دار نہیں رہ سکتے۔ عامۃ المسلمین کو حق ہوگا کہ ایسے فساق و فجار حکمرانوں کے خلاف متحد ہوکر ان کی ذمہ داریوں سے ان کو الگ کریں۔ ہاں خانہ جنگی اور خون و خرابہ کی شکل اختیار نہیں کرنی ہوگی، جب تک کہ ایسے حکمران کفرِ بواح کا اظہار نہ کریں۔

اسلام کی تعلیمات کے مطابق جو امور قرآن و سنت میں وضاحت سے موجود نہیں، یعنی اصول موجود ہیں مگر اس کے فروع انسانی معاشرہ پر چھوڑ دیے گئے ہیں، ایسے امور میں مجلس شوریٰ اجتہاد کرتی رہے گی اور اجتہاد کے ذریعہ قوانین سازی کا عمل جاری رہے گا۔ اجتہاد کے ذریعہ اسلام کو ایک ارتقائی دین کی حیثیت حاصل ہے۔ اس طرح یہ دائمی دین خدا اور رسولِ اکرم ﷺ کے عطاکردہ اصولوں کی روشنی میں انسانوں کی رہنمائی کے لئے قیامت تک موجود رہے گا اور کبھی بھی یہ دین بند گلی میں جاکر نہیں رک سکتا۔

پاکستان کے قیام کے بعد سنجیدگی کے ساتھ اسلامی ریاست بنانے کی کوشش یا اس سمت میں پیش رفت نہیں ہوئی۔ بلکہ یہاں برطانوی سسٹم جو پہلے سے چل رہا تھا، جو سامراج کا چھوڑا ہوا نظامِ سیاست تھا، اس کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا اور آج تک ہمارے تمام ریاستی ادارے اسی سسٹم کے مطابق ہیں اور وہ کالے قوانین جو ظلم اور ناانصافی کے مظہر ہیں، وہ ابھی تک عوام کے لئے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔ پھر یہ نظامِ حکومت جس کو ڈیموکریسی کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ کہ یہ کفر و شرک کا فلسفہ اور اہلِ ایمان کے لئے قطعی طور پر ناقابل قبول ہے، مگر اس کے ساتھ یہ انسانی فطرت، مزاج اور بلند انسانی عقول کے بھی سراسر خلاف ہے۔ حقیقت میں یہ نظام دین و اسلام اور انسانی شرافت، دیانت اور غیرت کے خلاف بھی ایک سازش ہے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ریاست کے ہنگامی نوعیت کے مسائل آبادکاری، اقتصادیات وغیرہ کی طرف توجہ دی گئی اور ان پر جزوی طور پر قابو پالیا گیا۔ یہ اچھی بات تھی، یہ تو کرنا ہی تھا۔ مگر ریاست کے بنیادی مسائل، دستور سازی، تعلیمی نظام، سیاسی نظام اور خاص طور پر اسلامی ریاست کے قیام کی طرف پیش قدمی قطعی طور پر نہیں ہوئی۔ اس سے آج تک یہ خداداد مملکت محروم ہے۔ خلقِ خدا کے مطالبات اور کچھ دینی شخصیتوں کے اصرار پر لیپاپوتی کردی گئی کہ ایک عدد

قرارداد مقاصد منظور ہوئی، تعلیمات اسلامی بورڈ کا قیام عمل میں آیا، پھر اسلامی نظریاتی کونسل وجود میں آئی مگر یہ سب دکھانے کے لئے۔ ریاست کا اصل ڈھانچہ وہی سیکولر رہا۔ مذہب و سیاست کی تفریق، ڈیموکریسی کا نظامِ سیاست، لادین حکمرانوں کی کامیابی، سیاسی پارٹیوں کے ذریعے معاشرے کی تقسیم، سیاسی اور مذہبی پارٹیوں کا الگ وجود، مذہب میں فرقہ واریت اور سیاست میں پارٹی بازی، یہ سب لادین فلسفہ سیاست کے شاخسانے ہیں جن کو ہم نصف صدی سے زائد عرصہ سے بھگت رہے ہیں۔ یہ سب اس لئے ہے کہ ہم نے ڈیموکریسی جیسے خلافِ اسلام نظریے اور انسانی شرافت کے دشمن فلسفے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بلکہ اس کو پروپیگنڈہ کے زور پر اپنے سینے سے لگالیا۔ اس میں وہ خاص طبقہ، جس کو ہم مراعات یافتہ طبقہ کہتے ہیں، جس کو سامراج نے اس لئے تربیت دی تھی کہ وہ ان کے نظام کا وارث اور متولی بن سکے، اگر وہ طبقہ یہاں ڈیموکریسی نظام سے چمٹ گیا ہے تو اس کو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ طبقہ اس لئے پیدا ہوا تھا کہ وہ نئی ریاست کو سیکولر بنا کر چلائے اور پھر اس کی سیاسی تربیت ہی اس طریقہ پر ہوئی تھی کہ وہ اس نظام کے اندر رہ کر حکومت کرسکے اور اسی میں ان کو اور ان کے خاندان کو مستقل طور پر حکمرانی کرنے کا حق حاصل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اب تک یہی ہوا ہے اور آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔

مگر المیہ یہ ہے کہ جو افراد اور گروہ دورِ غلامی میں استعمار کے تسلط کے خلاف تھے اور استعماری نظامِ سیاست کے کٹر دشمن تھے، وہ بھی یہاں پاکستان میں اسی نظامِ سیاست کے اسیر ہوچکے ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا بھی یہی استعماری سیاست ہے۔ ظاہری طور پر وہ اسلام کے نعرے کو بھی نہیں چھوڑتے۔ بلکہ اپنی اپنی تعبیر اسلام کے مطابق جماعت سازی کا عمل جاری رکھا ہوا ہے اور سیاست بازی تو پوری کی پوری وہ مغربی طرز کی سیاست پر کیے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کردیا ہے کہ پارلیمنٹ میں کوئی قانون بھی اسلام کے خلاف نہیں بن سکتا۔ بریں عقل و ہمت باید گریست۔

نیشنلزم، سوشلزم اور ڈیموکریسی کے اوپر لفظِ اسلام لگانے سے وہ اصطلاحیں اور فلسفے بدل نہیں سکتے، البتہ ایک لغو اور بے ہودہ اصطلاح وجود میں آئے گی جس کو انسانی عقول تسلیم نہیں کرسکتے۔ اسلام کا الگ فلسفہ ہے، اس کا اپنا سیاسی نظام ہے۔ ڈیموکریسی کا فلسفہ اور اس کا نظام الگ ہے۔ اب اسلامی ڈیموکریسی کی اصطلاح وضع کرنا حماقت کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟ ٹھیک اس طرح اسلامی سوشلزم کی اصطلاح بھی احمقانہ تصور ہوگی۔

پاکستان میں اس وقت نظامِ سیاست کی بحث جاری ہے۔ ایسے میں جو تجربے ہوچکے ہیں اور ڈیموکریسی کے نتائج بھی سامنے آچکے ہیں، اب کیوں نہ سنجیدگی کے ساتھ اسلام کے فلسفہ سیاست کو ملک میں نافذ کرنے کی سعادت حاصل کی جائے اور قرآن و سنت کی روشنی میں توحید پر کامل یقین رکھ کر ایسا نظام اپنایا جائے جو عین فطرتِ انسان کے مطابق ہے۔ جس میں ربِ ذوالجلال کی رضامندی بھی مضمر ہے۔

بدأ الاسلام غريبا وسيعود غريبا فطوبىٰ للغرباء .... وفي رواية سبع مرات

اسلام کا آغاز اجنبیت وغربت کے ماحول میں ہوا اور عنقریب اس کی پھر یہی حالت ہوجائے گی۔ پس ایسے لوگوں کے لئے خوشخبری ہے اور ایک روایت کے مطابق فرمایا کہ ان کے لئے سات مرتبہ خوشخبری ہے۔